© rasailojaraid.com

تنقید و تبصرہ

پاکستانی کلچر

قومی کلچر کی تشکیل کا مسئلہ

از جمیل جالبی

واقعہ یہ ہے، جیسا کہ جالبی صاحب نے مقدمے میں لکھا ہے، زیر نظر کتاب "اس موضوع پر اردو میں پہلی مستقل کتاب ہے" اور پھر ان کا یہ ارشاد بھی بالکل صحیح ہے کہ "میں نے جو کچھ کہا ہے، پوری ایمان داری، جرأت اور ذمہ داری سے کہا ہے" بلکہ اس ضمن میں اگر یہ کہا جائے کہ ایسے نازک موضوع پر ایک مستقل کتاب میں اور ایک ذمہ دار مصنف کے قلم سے اتنی جرأت صاف گوئی، سنجیدگی اور یقین و خلوص کے ساتھ اب تک کبھی اس طرح نہیں لکھا گیا، تو یہ مبالغہ نہیں ہوگا۔ اس صورت میں قارئین کتاب سے مصنف کی یہ "خواہش" بالکل واجبی ہے کہ وہ "اس کتاب کو اسی خلوص اور ذمہ داری سے پڑھیں اور ذاتی اختلاف سے ہٹ کر اس موضوع پر اپنے اپنے طور پر غور کریں تاکہ اس غور و فکر اور اس بے چینی سے زندگی میں مثبت اقدار کا ایک ایسا نظام خیال پیدا ہو سکے، جو ہمارے جدید ذہنی، مادی، معاشرتی و تہذیبی تقاضوں کو آسودہ کر سکے۔"

پاکستانی ایک قوم ہیں، اور ان کا اپنا قومی کلچر ہونا چاہیئے، اس سے تو بہر حال کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن اختلاف اور وہ بھی شدید اختلاف دراصل قوم اور کلچر، ان دو لفظوں کے بارے میں پایا جاتا ہے۔ جالبی صاحب نے کلچر سے جو مراد لی ہے' ہمارے خیال میں پاکستانی رائے عامہ کے ایک بہت بڑے حصے کو جو اس وقت بڑا نمایاں (Consensus) اور موثر ہے' اس سے اتفاق نہیں' اور پھر پاکستانی قوم کی کیا نوعیت ہے، اس میں آج کی دنیا میں تمام دوسری قوموں کی طرح جغرافیائی وطن مقدم ہے اور آیڈیالوجی (نظریہ حیات) موخر، یا آیڈیالوجی مقدم ہے اور جغرافیائی وطن موخر۔ جالبی صاحب نے ایک جگہ (صفحہ ۱۲۰) پاکستان کا اسرائیل کے حالات و عوامل سے مقابلہ کیا ہے وہ پاکستان کی "قدیم آبادی" اور "ہجرت کرنے والی آبادی" کے سلسلے میں جو ان کے الفاظ ہیں ——

"...... تحریک پاکستان میں پیش پیش رہی ہے، بنیادی طور پر اس ملک کے لئے شدید محبت کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جذبہ رکھتی ہے۔ اس ملک کو عظیم بنانا اس کا آدرش ہے، وہ اسی جذبے کے ساتھ اس ملک میں داخل ہوئی تھی ....." کہتے ہیں:۔ "وہاں بھی قدیم اور نئی آبادی کی آمیزش کا یہی رنگ ڈھنگ تھا.... اس ملک کی بنیاد بھی مذہب پر قائم تھی ..... وہاں آدرش کو ہر سطح پر محفوظ رکھا گیا اور نیک نیتی و خلوص کے ساتھ اور عشق کے احترام کو ہر چھوٹے جذبے سے بلند رکھا، جس آدرش کے ساتھ ملک کو وجود میں لایا گیا، اسے پورا کرنے کی پوری پوری کوشش کی گئی ..."

ہو سکتا ہے اسرائیل کے بعض "حالات و عوامل" مصنف کے خیال میں پاکستان سے ملتے ہوں لیکن اُن کا اِن دونوں ملکوں کو ایک سطح پر رکھ کر مقابلہ کرنا، جالبی صاحب کے اس انداز فکر سے اتفاق کرنا مشکل ہوگا۔ بے شک تصور پاکستان میں ان عوامل کا بڑا ہاتھ ہے، جو مغل سلطنت کے زوال کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کے مذہبی طبقوں میں بروئے کار رہے، لیکن پاکستان بنا حق خود ارادی کے اصول پر ہے، یعنی برصغیر کے وہ علاقے جہاں مسلمان اکثریت میں تھے، انہیں دہلی کی مرکزی حکومت سے الگ ہونے کا حق دیا گیا۔ اور وہ الگ ہو گئے، غرض یہ مسئلہ نظریاتی کم اور آئینی زیادہ تھا۔ اسی لئے حصول پاکستان کی جدوجہد میں وہ لوگ جو شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کے سلسلے کے دوسرے بزرگوں کے نام لیوا تھے، ان کی غالب اکثریت اس جدوجہد سے بے تعلق رہی، اور اُن لوگوں نے اس کی قیادت کے فرائض سر انجام دیئے، جو اس مسئلے کو خالص آئینی و سیاسی بنیادوں پر حل کرنے کے اہل تھے۔

نظریاتی لحاظ سے خواہ کچھ بھی کہا جائے آئینی طور پر پاکستان کی تحریک کا سلسلہ دراصل سر سید سے شروع ہوتا ہے۔ دونوں کے نظام حکومت کے دور میں انہوں نے دیکھا کہ اس نظام میں ہندوستان کے مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندو اکثریت کے غلام رہیں گے، چنانچہ انہوں نے اس نظام ہی کی مخالفت کی لیکن جب برطانوی حکومت کو مجبوراً یہ نظام نافذ کرنا پڑا، تو پھر یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ مسلمانان ہند کو ہندو اکثریت کے مستقل غلبے سے کس طرح بچایا جائے۔ اسی ضمن میں جداگانہ انتخابات کا حق منوایا گیا۔ پھر لکھنؤ پیکٹ ہوا۔ جس میں مسلم اکثریت کے صوبوں کے نمائندہ اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی کم کر کے مسلم اقلیت کے صوبوں میں ان کو آبادی سے زیادہ نمائندگی دی گئی۔ اس کے بعد جب کونسلوں اور اسمبلیوں میں سرکاری نامزد ارکان کا سسٹم ختم کیا جانے لگا تو پھر مسلمانوں کے حقوق کا مسئلہ اور بھی شدت اختیار کر گیا۔ اسی دوران میں ۱۹۲۷ء میں مسلم لیگ نے سر محمد یعقوب کا ایک فارمولا منظور کیا۔ جس کی رو سے ہندو اکثریت کو یہ دعوت دی گئی کہ اگر وہ برصغیر کے پانچ صوبوں کی اسمبلیوں میں مسلمان نمائندوں کی عددی اکثریت تسلیم کر لے تو مسلمانوں کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باقی صوبوں میں ہندو اکثریت کے تحت رہنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ کانگرس نے پہلے تو یہ تجویز مان لی، لیکن بعد میں وہ اس سے پھر گئی اسی کی وجہ سے مولانا محمد علی نے کانگرس کو چھوڑ دیا، اس کے بعد ہی جدوجہد پاکستان کی شروعات ممکن ہو سکیں۔ اور اس طرح مسلم اکثریت کے صوبوں میں ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام اس تمام آئینی جدوجہد کا نقطۂ عروج قرار پاتا ہے۔

مختصراً مملکت پاکستان، پاکستان میں رہنے والوں کی اکثریت کے حق خود ارادیت کا عملی مظہر ہے، اس کے برعکس مملکت اسرائیل اُن لوگوں پر مشتمل ہے، جو باہر سے وہاں لائے گئے، اور اس سرزمین کے اصل باشندوں کو وہاں سے نکال کر ان کی جگہ اس غیر ملکی اقلیت کو وہاں کا زبردستی مالک بنا دیا گیا۔ پاکستان، پاکستان میں بسنے والے عوام کی آزادانہ رائے دہی سے اگست ۱۹۴۷ء میں بنا، اسرائیل بڑی سلطنتوں کی مالی مدد اور ان کے دیئے ہوئے اسلحہ سے بنا، اس لئے اس کی اب تک ایک غاصب کی حیثیت ہے، جیسے بعض افریقی ملکوں میں سفید فام مملکتیں ہیں۔

پاکستان اور اسرائیل کو ایک سطح پر سمجھنے کا یہ انداز فکر جو کم و بیش پوری کتاب میں کسی نہ کسی شکل میں کارفرما نظر آتا ہے۔ ہمارے نزدیک مصنف کے لئے سب سے بڑی الجھن ہے۔ اسی لئے وہ پاکستان کے موجودہ حالات سے جو ایک معاشرے کے دورِ انتقال کے لوازم ہوتے ہیں، اتنے خفا اور اس قدر ناامید ہیں۔ اگر مملکت پاکستان کے قیام اور اس کی پچھلی سترہ سال کی زندگی کو اس سرزمین کے آئینی ارتقا، اور اس میں بسنے والے عوام کی اجتماعی تاریخ کے پس منظر میں دیکھا جائے، تو اس وقت ہمارے ہاں بقول مصنف کے، جو اس قدر تضاد، نفرت، منافقت اور باہمی بے اعتمادی نظر آتی ہے، وہ زیادہ ڈرانے والی نہیں رہتی۔ اور چشم تصور کو مستقبل کا نقشہ صاف دکھائی دینے لگتا ہے۔

برصغیر کے جن علاقوں سے آج پاکستان عبارت ہے، وہ برطانوی عہد کے دو سو سالوں میں تعلیمی، معاشی اور صنعتی دوڑ میں دوسرے صوبوں سے پیچھے رہ گئے تھے، اسی کی وجہ سے وہ سماجی اور ذہنی لحاظ سے بھی پسماندہ ہے۔ اور ان میں اتحاد و یگانگت نہ پیدا ہو سکا۔ اب یہ علاقے بڑی سرعت سے تعلیم، معیشت اور صنعت کے میدان میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور اگرچہ ابھی ان کا انتقالی دور ہے، اور اسی کی وجہ سے یہاں وہ سب خرابیاں ہیں، جن کا ذکر جالبی صاحب نے بڑی تفصیل سے کیا ہے، لیکن جیسے جیسے پاکستانی معاشرے کی معاشی بنیادیں مضبوط ہوں گی اس کا موجودہ سماجی اور ذہنی نراج بھی کم ہوتا جائے گا، یہاں ایک مشترک زبان بھی پھیلے گی، اور یہاں کا ایک مشترک کلچر بھی ہوگا۔ لیکن یہ زبان، یہ کلچر اور یہ ادب ایک خودرو درخت کی طرح اسی زمین سے اُبھرے گا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی کی آب و ہوا میں پڑے گا، اور یہ اپنی ملکی و قومی خصوصیات سے متاثر ہوگا، البتہ اس کے برگ و بار ان عوامل کا لازماً پر تو ہوں گے، جو اس مملکت کے قیام کا محرک تھے، اور اگر وہ نہ ہوتے، تو اس برصغیر میں مسلمانوں کی ایک الگ مملکت بنانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

بے شک ہمیں اپنے آپ کو ایک متحد و متجانس قوم بنانا ہے اور ظاہر ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اب بقول مصنف کے "ہم اگر خود کو ایک متجانس قوم بنا سکتے ہیں، تو اس ورثے کے بل بوتے پر۔ ہم کیا ہیں، اور ہمیں کدھر جانا ہے، ان بنیادی سوالات کا جواب ہم اسی تہذیبی ورثے اور ماضی کی تاریخ کے شعور سے دے سکتے ہیں۔ یہی وہ سطح ہے جس پر ہم سے بارہ سو میل دور بسنے والے بنگالی علاقائی سطح سے بلند ہو کر قومی سطح پر یک جہتی کے رشتہ میں پیوست ہو سکتا ہے۔"

یہ تہذیبی ورثہ مصنف کے نزدیک "ہند مسلم ثقافت" ہے اور موصوف کا کہنا ہے کہ ہماری پہلی غلطی یہ تھی کہ برصغیر کی تقسیم کے ساتھ ساتھ ہم نے اپنی ذہنی و روحانی ورثے، تہذیبی و تاریخی روایت کی بھی تقسیم کر دی" اور گویا اس طرح جغرافیہ ماضی کی تاریخ پر غالب آگیا۔ اور مصنف کے الفاظ ہیں۔

"نیا جغرافیہ ماضی کی تاریخ کو نہیں بدل سکتا، لیکن، ماضی کی تاریخ کا شعور کسی قوم کا جغرافیہ بدل سکتا ہے۔"

جالبی صاحب کا یہ نقطہ نظر محل کلام ہے، بے شک "ہند مسلم ثقافت" کے ہمارے تہذیبی ورثہ ہونے سے انکار نہیں، لیکن اس "ہند مسلم ثقافت" کے بھی کئی پہلو اور کئی مظاہر ہیں۔ اگر جالبی صاحب اس کے فنون لطیفہ پر زور دیتے ہیں۔ تو دوسرے اس کے خالص مذہبی پہلوؤں کو اس ورثے کا حاصل سمجھتے ہیں، اور آج پاکستان میں انہی طبقوں کو اثر و نفوذ حاصل ہے۔ پھر موصوف "ہند مسلم ثقافت" کو ایک جامد اور ناقابل تغیر چیز کیوں سمجھتے ہیں، اس ثقافت کا دہلی میں ہر روز اور رنگ تھا۔ لکھنؤ جا کر اس نے اور شکل اختیار کر لی، پھر حیدرآباد دکن میں اس کا اور طرح ظہور ہوا۔ نیز ہر طبقے کی اپنی مخصوص "ہند مسلم ثقافت" تھی اور اب جب پاکستانی علاقے اس کے وارث بنتے ہیں، تو وہ "ہند مسلم ثقافت" کی ایک خاص چھاپ کو اتنا اہم کیوں سمجھیں کہ وہ اس کی وجہ سے قوم کا جغرافیہ بدلنے کی کوشش کریں۔

واقعہ یہ ہے کہ قوم کا جغرافیہ بمشکل بدلا جا سکتا ہے، اور پھر جالبی صاحب تو اسے ماضی کی تاریخ کے ایسے شعور سے بدلنے کے مدعی ہیں، جو بے حد کمزور مبہم اور ایک انتہائی محدود طبقے کی میراث ہے، جس کی جڑیں اب کہیں بھی نہیں۔ "ہند مسلم ثقافت" کے وجود سے ہمیں انکار نہیں۔ ایک خاص زمانے میں ایک خاص طبقے نے اپنے ایک خاص ماحول میں اسے ایک خاص شکل دی۔ اس کے بعض اچھے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلو بھی تھے اور بعض ناقص بھی۔ اب اس ثقافت کو اس نئے ملک اور نئی قوم اور یہاں کی آزاد، عوامی اور ترقی پذیر فضا میں برگ و بار ہونے کا موقع ملا ہے۔ جغرافیہ کا اور اس سے ہماری مراد اس کے تمام مادی و معنوی پہلو ہیں، اس ثقافت کی تشکیلِ آئندہ کے معاملے میں اپنا خاص مقام ہونا چاہیئے۔ اور اسے "ماضی کی تاریخ کے شعور" کے تحت بدلنے کا نتیجہ لازماً وہ نفسیاتی جھلاہٹ ہوگی، جس کا اس کتاب میں بار بار مظاہرہ ہوا ہے۔

مثال کے طور پر کتاب کا پہلا باب یوں شروع ہوتا ہے:۔

"دہلی کے چاندنی چوک میں ایستادہ گھنٹہ گھر نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب بارہ بجنے کا آواز بلند اعلان کیا، تو دنیا کے نقشے پر ایک نئی آزاد مملکت ابھر آئی۔ اس مملکت کا نام پاکستان تھا۔ پاکستان ہماری آزادی کا آدرش ہماری آرزوؤں کا کعبہ، جہاں ہندوستان کے ہر خطے کے مسلمان مل جل کر ایک قوم کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کرنے والے تھے، جہاں وہ اپنی عظیم روایات کے سہارے نئی تہذیبی قوتوں کا ثبوت دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔"

اس کے بعد کیا ہوا، مصنف لکھتے ہیں، "لیکن جب آزادی آئی، تو اپنے جلو میں دو چیزیں لے کر آئی۔ ایک نفرت اور دوسرا تضاد۔ نفرت نے سارے برصغیر کو ہندو مسلم فسادات کی آگ میں جھونک دیا۔ اور تضاد کے عفریت نے جس پر آزادی سے پہلے ہم نے کبھی توجہ نہ دی تھی، طرح طرح کے تھکا دینے والے مسائل میں الجھا دیا۔ آزادی کے بعد ہم سب نے محسوس کیا کہ ہمارے پاس کوئی تہذیبی سرمایہ ایسا نہیں ہے، جس سے ہم اس چیلنج کو قبول کر سکیں، جو آزادی اپنے ساتھ لائی تھی۔ "مروجہ" مذہب کا اخلاقی و تہذیبی سرمایہ بظاہر ہمارا ساتھ دینے کے باوجود اپنی چمک دمک گنوا رہا ہے"

مصنف نے بڑی دیانت داری، جرأت سے اور کافی تفصیل کے ساتھ ان آلام و مصائب کا ذکر کیا ہے، جن سے آج ہمارا معاشرہ دوچار ہے۔ اور اس میں حکمراں طبقوں سے لے کر مذہبی طبقوں میں سے کسی کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ اور بڑے متوازن اور سنجیدہ طریقے سے ان سب پر تنقید کی ہے۔ لیکن ایک زرعی معاشرہ جب صنعتی معاشرہ میں بدلنا شروع ہوتا ہے، تو اس میں قدرتاً جو معاشی، سماجی، اخلاقی و ذہنی افراتفری ہوتی ہے، اس سے جالبی صاحب ضرورت سے زیادہ پریشان ہیں لیکن ان کی یہ پریشانی بڑے مخلصانہ اور ہمدردانہ جذبات پر مبنی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"...... معاشرے کے مسائل اور خواہشات کے درمیان زبردست بحرانی تضاد اندر ہی اندر گھن کی طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لگ رہا ہے۔ پاکستان ایک غیر آسودہ خواہشات کا معاشرہ ہے۔ وسائل اور خواہشات کا یہ تصادم اور تضاد زندگی کی ہر سطح پر ہمارے تخلیقی سوتوں کو خشک کر رہا ہے۔ ہماری زندگی کا نہ کوئی مقصد ہے، اور نہ کوئی جہت۔ ہمارے سامنے تہذیبی سطح پر اقدار و اخلاق کا کوئی ایسا نظام نہیں ہے، جس پر ہم مثبت طریقے سے زندگی کا کوئی نیا قلعہ تعمیر کر سکیں۔ اسی وجہ سے سارا معاشرہ منتشر ہے..... خیالات و عقائد کا وہ نظام، جس پر ہم صدیوں سے یقین رکھتے چلے آرہے تھے، اب ہمیں بے معنی اور از کار رفتہ نظر آنے لگا ہے، اس تہذیبی خلا کی وجہ سے ہم ایک طرف تو یورپ سے لباس، آداب معاشرت تعمیرات، فنون لطیفہ، مادی ترقی اور اخلاقی ضابطوں کی سطح پر شکست کھا رہے ہیں اور دوسری طرف ہمارے ذہنوں پر بدحالی اور پسپائیت کی دھند کے دبیز پردے پڑ رہے ہیں۔ اور ہم رفتہ رفتہ اس خزاں رسیدہ درخت کی مانند ہوتے جا رہے ہیں، جس کے سب پتے جھڑ گئے ہیں اور وہ ٹنڈ منڈ تنہا کھڑا ہو؟

مصنف اس اندوہ ناک صورت حال کا نقشہ اسی انداز میں برابر کھینچتے چلے گئے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "آپ کو تہذیبی خلا اور تضاد کا نقشہ دیکھنا ہو تو کسی سرکاری دفتر میں چلے جائیے۔ کسی تاجر اور صنعت کار سے مل لیجئے۔ کسی مزدور یا کلرک سے بات کر دیکھئے کسی وکیل، ڈاکٹر، پروفیسر، صحافی ادیب، طالب علم، مولوی یا سیاست داں سے گفت گو کر لیجئے۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس کے ذہن میں نہ کوئی جہت ہے اور نہ کوئی مقصد، وہ جو کچھ کہہ رہا ہے خود اس کی تردید کر رہا ہے۔ وہ تضاد کی جھلسا دینے والی آگ میں جل رہا ہے، جہاں اسے نہ کوئی راستہ نظر آرہا ہے اور نہ زادِ راہ ....." اس سے آگے لکھتے ہیں "ایک تضاد دوسرے تضاد کو جنم دے کر زندگی کو زیادہ ناآسودہ اور بدحال بنا رہا ہے..." نفرت کا وہ عمل جو ہندو مسلم فسادات کی شکل میں ابھرا تھا، اب خود ایک دوسرے کو کاٹ رہا ہے۔ اب ہمیں ایک دوسرے سے نفرت ہے۔ اپنی اقدار اور اپنے ماضی سے نفرت ہے"

عجب بات یہ ہے کہ یہی طبقے جن کے تضاد اور نفرت کا مصنف نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے اس "ہندمسلم ثقافت" اور "ماضی کی تاریخ کے شعور" کے حامل ہیں، جن کے زور سے وہ جغرافیہ کو بدلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کی یہ بات بڑی اونچی سہی، لیکن ہے اَن ہونی۔

ہمارے خیال میں مصنف کی یہ ساری پریشانی مایوسی اور برہمی محض اس لئے ہے کہ وہ پاکستان کو اپنی مخصوص "ہندمسلم ثقافت" اور اس کے علم برداروں کے ایک خاص گروہ کے پس منظر میں دیکھ رہے ہیں۔ ورنہ اگر وہ اوپر سے دیکھنے کے بجائے نچلی سطح سے پاکستان کی سترہ سالہ زندگی کو دیکھتے تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ کبھی لتنے مایوس نہ ہوتے۔ اس مختصر سی مدت میں دور افتادہ دیہات اور پہاڑی علاقوں میں تعلیم کا شوق کتنا بڑھا ہے، اور وہاں نئی زندگی سے واقفیت کا دائرہ کتنا وسیع ہوا ہے اور پھر صنعتوں کی وجہ سے کارخانہ داروں کے منافع کو چھوڑیئے، عام آبادی میں زندگی کی کتنی زبردست لہر اُبھر رہی ہے اگر مصنف ان پر ایک نظر ڈال لیتے، تو وہ کبھی نفرت، تضاد، تہذیبی خلا، اور اس طرح کی دوسری چیزوں سے جو واقعی ہمارے ہاں ہیں، اتنے بددل نہ ہوتے۔

باقی رہا پاکستان کے مختلف علاقوں میں علاقائیت کے جذبات کا فروغ۔ تو یہ بھی چنداں غیر متوقع نہیں، اور نہ صرف پاکستان سے مخصوص ہے۔ اس لئے اس پر زیادہ نالہ و شیون کرنا بے کار ہے۔ متحدہ قومیت کی تشکیل کا ایک مرحلہ یہ بھی ہوتا ہے۔ اب پاکستان میں جہاں ایک طرف علیحدگی پسند علاقائی جذبات اُبھر رہے ہیں، وہاں دوسری طرف معاشی و سیاسی ضرورتیں اور مذہبی اور روحانی قدریں ان علاقوں کو ایک دوسرے سے قریب لا رہی ہیں۔ اور انشاءاللہ آخرالذکر مرکزیت دوست قوتیں، مرکز گریز رجحانات پر غالب آئیں گی۔ کیونکہ زمانہ اسی کا مقتضی ہے اور دوسرے اسی میں علاقوں کی غالب اکثریت کا فائدہ ہے، اور اسی سے ان کی معاشی زندگی وابستہ ہے،

غرض جمیل جالبی صاحب کی یہ کتاب ایک چیلنج ہے ان سب لوگوں کے لئے جو پاکستان کے ماضی، حال اور مستقبل کے متعلق سوچتے ہیں۔ اور اس کی اصلاح و بہتری کے لئے جو خود ان کی اپنی اصلاح و بہتری ہے، کوشاں ہیں مصنف نے اس کتاب پر واقعی بڑی محنت کی ہے، اور اس کے مندرجات کو بڑے موثر، دل آویز ادبی اسلوب میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ یہ کتاب فکر انگیز بھی ہے اور ایک ادبی شاہکار بھی۔

کاغذ، طباعت، کتابت اور جلد اعلیٰ، ضخامت ۲۴۴ صفحے۔ قیمت آٹھ روپے
ناشر:۔ مشتاق بک ڈپو شلٹن روڈ، کراچی ۱

(ا۔ س)

معرفت الہیہ مصنفہ عارف باللہ حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوری صاحب از اکابر خلفاء حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ صاحب۔ ناشر مکتبہ نظام۔ کمریل گنج۔ کانپور۔ (انڈیا)

شاہ عبدالغنی صاحب کا وطن ضلع اعظم گڑھ ہے، اور اس وقت آپ کی عمر نواسی سال ہے آپ کے دادا صاحب نسبت بزرگ تھے اور والد صاحب حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے سلسلے میں مرید تھے۔ شاہ عبدالغنی صاحب نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب سے بیعت کی، اور آپ کے

© rasailojaraid.com